urduebooks.com
جیئیں ہم کس کے لیئے
خواتین کی کہانیاں

کامران کا باپ دن رات رنگینیوں میں گم رہتا۔ وہ اپنے نفس کو خوش کرنے میں اس قدر غافل ہو چکا تھا کہ اپنے بیٹے کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا، اس کو کوئی فکر نہیں تھی کہ کامران پڑھ رہا ہے یا نہیں اور اس کی کلاس میں کیا پوزیشن ہے۔ باپ کی اس غفلت کی وجہ سے کامران من مانی زندگی بسر کرنے لگا۔ وہ کالج ضرور جاتا تھا مگر تفریحا...... پڑھنا اس کے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ایک امیر باپ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے لڑکی بھی اس کے آگے پیچھے پھرتے تھے اور اس کی دوستی کے خواہاں رہتے تھے۔ یہ چند مطلبی لڑکے تھے جو کھیل کود کو اپنا شعار سمجھتے تھے اور پڑھائی سے دور بھاگتے تھے، انہی میں ایک بلال اور دوسرا کمال تھا اور تیسرے دوست کا نام عمار تھا۔

کامران بذات خود برا لڑکا نہیں تھا۔ وہ پڑھنا چاہتا تھا مگر ماں نہیں تھی اور باپ بھی گھر میں اکثر غیر موجود ہوتا تھا، صرف ملازم ہوتے جن سے وہ کیوں دیتا......

پس وہ کالج کے بعد اپنے تینوں دوستوں کو گھر لے جاتا جہاں نوکر کھانا کھلاتے اور یہ دوست روز دعوت اڑاتے، وی سی آر پر فلمیں دیکھتے یا پھر فٹ بال کھیلتے۔ یوں کامران کو پڑھنے یا کالج کا کام کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تبھی اس کی تعلیمی پوزیشن روز بروز کم سے کم تر ہوتی جا رہی تھی اور اب تو اساتذہ بھی اس سے شاکی رہنے لگے تھے۔

کامران کے دوست خود پڑھتے تھے اور نہ ہی اسے پڑھنے دیتے تھے۔ حتیٰ کہ کالج آ کر بھی کلاس میں آنے اور پیریڈ اٹینڈ کرنے کی بجائے وہ اس کو میدان میں لے جاتے اور فٹ بال کھیلتے، یوں کامران کا دل پڑھائی سے اُچاٹ ہوتا گیا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں اور عائشہ کلاس کی طرف جاتے ہوئے گراؤنڈ سے گزر رہے تھے کہ کامران کے دوست نے اتنی زور سے فٹ بال پھینکی کہ بال سیدھی عائشہ کے سر پر لگی۔ اس کو بہت غصہ آیا تبھی وہ بال لینے آ گئے۔ تو عائشہ نے ان کو ڈانٹا کہ تم لوگ کیا اندھے ہو کہ کچھ نظر نہیں آتا، اگر بال آنکھ میں لگ جاتی تو کون ذمہ دار ہوتا......؟

ہم ذمہ دار ہوتے۔ کامران کے دوستوں نے کہا تو عائشہ نے جل کر جواب دیا کہ تم خاک ذمہ دار ہوتے، تم جیسے پاگل تو بس ہر وقت فٹ بال ہی کھیل سکتے ہیں، ان کو ذمہ داریوں کا کیا احساس؟ یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ کلاس کی طرف آ گئی۔ اسی وقت ایک لیکچرر کا ادھر سے گزر ہوا، انہوں نے ان لڑکوں کو کھیلتے پایا تو پاس بلا کر کہا کہ یہ کھیل کا پیریڈ نہیں ہے لہذا جاؤ اور جا کر کلاس اٹینڈ کرو۔ تبھی یہ بھی کلاس میں آ گئے۔ اسی وقت لیکچرر اندر آ گئے اور سوالات کرنے لگے۔ سب نے ہاتھ کھڑا کیا مگر کامران اور اس کے دوست گم صم بیٹھے تھے۔ ٹیچر جانتے تھے ان لڑکوں کو کچھ نہیں آتا۔ پس انہوں نے باقی طلبہ کو چھوڑ کر انہی سے سوالات شروع کر دیئے۔

تینوں کو باری باری کھڑا کیا مگر تینوں میں سے کسی نے ان کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ پھر انہوں نے عائشہ سے کہا کہ ان کو جواب بتاؤ۔ عائشہ نے فوراً بتایا اور یہ شرمندہ ہو گئے۔ لیکچرر نے وارننگ دی کہ اگر تم تینوں کل تیاری نہیں کر کے آئے تو میں آپ لوگوں کو کلاس سے باہر کر دوں گا۔

پیریڈ ختم ہو گیا تو عائشہ نے ان سے کہا کہ بے عزتی کرانے سے بہتر ہے کہ پڑھ کر آیا کرو اور ہر وقت فٹ بال نہ کھیلا کرو۔ اس پر کامران بولا۔ اگر تم مجھ سے دوستی کر لو تو وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی فٹ بال نہیں کھیلوں گا بلکہ پوزیشن لوں گا اور تم کو ہرا دوں گا۔

چلو مقابلہ رہا۔ عائشہ نے اس کو چیلنج کیا۔

ہاں مقابلہ رہا۔ اس نے بھی لہجے کی مضبوطی سے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے کہا۔ اگلے روز جب کلاس ہوئی تو کامران کو عائشہ کے برابر والی نشست ملی اور وہ کھیلنے بھی نہیں گیا مگر جب لیکچرر نے سوالات شروع کئے تو وہ گھبرانے لگا۔ عائشہ نے اس کی کیفیت دیکھی تو مسکرا دی اور جب لیکچرر نے کامران سے سوال کیا، وہ پریشان ہونے لگا تبھی عائشہ نے سوال کا جواب پرچے پر لکھ کر اس کے آگے کر دیا، اس نے جواب پڑھا اور سر کو بتا دیا۔ اس روز سے ان دونوں کی دوستی ہو گئی۔

ایک روز کامران نے عائشہ سے عجیب سوال کر دیا کہا۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟ یہ سوال سن کر وہ اداس ہو گئی۔ کہنے لگی۔ کامران! تم ایک امیر باپ کے بیٹے ہو اور میں ایک غریب باپ کی بیٹی ہوں، ہمارے اور تمہارے درمیان اتنا زیادہ فرق ہے کہ کم از کم اس جہان میں تو ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔ وہ کہنے لگا۔ بس اتنی سی بات سے پریشان ہو، یہ کوئی پریشانی کی بات ہے ہی نہیں کیونکہ میری نظر میں امیری، غریبی کوئی معنی نہیں رکھتی، تم فکر نہ کرو، میں اپنے ابو سے بات کر لوں گا...... بس تم اپنی رضامندی مجھے بتا دو۔

کامران کا خیال غلط نکلا کیونکہ امیری و غریبی کا فرق معنی رکھتا ہے۔ جب اس نے اپنے باپ سے بات کی تو اس کے ابو نے نہ صرف صاف انکار کر دیا بلکہ کامران کو بہت ڈانٹا

اور کہا۔ خبردار آئندہ ان کم ذات لوگوں کا میرے سامنے نام بھی مت لینا کیونکہ موری کی اینٹ چوبارے میں نہیں لگتی اور نہ ہی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگ سکتا ہے۔

کامران بہت بدمزہ ہوا۔ وہ باپ کا جواب سن کر مرجھا سا گیا لیکن باپ نے اس کی ذہنی اذیت کا کوئی خیال نہ کیا بلکہ اس کو کہہ دیا کہ میں تمہاری شادی اپنے دوست کی بیٹی حنا سے کروں گا، وہ کروڑ پتی لوگ ہیں اور ان کا بہت بڑا بزنس بیرون ملک ہے۔

کامران ایف اے میں فیل ہو گیا۔ باپ نے اسے بیرون ملک تعلیم کے لئے بھجوانے کا انتظام کیا۔ وہ لندن جانا نہیں چاہتا تھا اور ہر حال میں عائشہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے عائشہ سے کہا کہ ابو ایسے نہیں مانیں گے، تم میرے ساتھ نکل چلو، میں تم کو اپنی خالہ کے گھر لے جاؤں گا اور پھر ہم وہاں نکاح کر لیں گے۔

عائشہ بولی۔ میرے ابو کا کیا ہوگا کیونکہ وہ مجھ کو بیٹی نہیں بیٹا سمجھ کر پڑھا رہے ہیں، ایسا میں ہرگز نہ کروں گی، بیشک عمر بھر شادی نہ ہو۔ انہی دنوں کالج میں سالانہ فنکشن ہوا جس میں کامران کے والد کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا۔ جب وہ مہمان خصوصی بنے اسٹیج پر بیٹھے تھے اسی وقت ان طلبا و طالبات کو انعامات دینے کے لئے اسٹیج پر بلایا گیا جنہوں نے اپنی کلاسوں میں فرسٹ پوزیشن لی تھی۔ عائشہ کو بھی بلایا گیا تھا اور قائم خان نے اس کو اول پوزیشن آنے پر انعام دیا تب اس کو پتہ چلا کہ یہ وہی عائشہ ہے جس سے اس کا بیٹا شادی کرنے کو کہہ رہا تھا۔ بہرحال قائم خان اس لڑکی کی خوبصورتی سے بیحد مسحور ہوا اور وہ اس کے حسن میں کھو کر رہ گیا۔

آج گھر آکر اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے بیٹے کا داخلہ انگلینڈ کرانے کے لئے اپنے دوست کو فون کیا اور پھر جلد از جلد تمام عمل مکمل کرانے میں صرف دو ماہ لگے اور کامران کو انگلینڈ بھجوا دیا اس کے بعد وہ قدم اٹھایا جسکے بارے میں کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

<u>قائم خان کی عمر پچاس برس تھی جبکہ عائشہ کی عمر صرف سترہ سال تھی مگر عمر کے اس فرق کو بھی پست پشت ڈال کر وہ صرف دولت کے زور پر عائشہ کے والد کے پاس گیا اور رشتہ طلب کیا۔</u>

عائشہ کے باپ نے سمجھا کہ یہ اپنے بیٹے کیلئے آیا ہے تبھی اس نے کہا۔ صاحب! آپ بڑے آدمی ہیں اور ہم بہت غریب لوگ ہیں پھر یہ رشتہ کیسے ہو سکتا ہے؟

کیوں نہیں ہو سکتا دین محمد! قائم خان نے کہا۔ امیر غریب سب انسان اللہ کی نظر میں برابر ہیں اور سب اسی کی مخلوق ہے، لہٰذا تم اس بات کو چھوڑ دو، ہاں اپنی شرطیں بتا دو، کہو تو تمہاری بیٹی کو ہم سونے میں تول کر لے جائیں۔ بنگلہ، زیورات، باغ، زمین جو کہو، اس کے نام لکھ دیں گے۔

دین محمد بیچارہ پریشان تھا، کیا جواب دیتا اس کو یقین نہیں آ رہا تھا ایک امیر آدمی اس کی مفلسی کے باوجود اس رشتے داری پر اس قدر بیتاب کیوں ہے۔ اس نے جھجکتے ہوئے ہاں کہہ دی مگر جب قائم خان نے کہا کہ وہ رشتہ اپنے بیٹے کے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے مانگ رہا ہے تو دین محمد کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

اس کو سوچتے پا کر قائم خان بولا۔ دیکھو دین محمد! اگر تم کو عزت راس نہیں ہے تو ہم کو بھی ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالنا آتا ہے۔ عزت اور شرافت سے بیٹی کو ہم سے بیاہ دو ورنہ ہم ویسے ہی اٹھا لیں گے تو بھی تم ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہیں کر سکو گے۔ پھر پولیس تمہاری نہیں ہماری سنے گی اور جب رپورٹ لکھوانے تھانے جاؤ گے تو جیل بھی تم ہی کو جانا ہوگا، بولو عزت منظور ہے یا بے عزتی ؟

یہ بات اس نے جتنی بے شرمی سے کہی تھی، وہ دین محمد کی کھوپڑی میں اچھی طرح آ گئی اور اس نے کہا کہ سوچ کر جواب دوں گا۔ سوچ کر کیا جواب دینا ہے، بس تیاری کرو ایک ہفتے کے اندر اندر نکاح کر کے بیٹی کو عزت سے رخصت کر دو۔ یہ ہمارے محلوں کی رانی ہوگی اور اپنی قسمت پر ناز کرے گی اور تم بھی ! کہ ہمارے ساتھ تمہاری رشتے داری تم کو فرش سے آسمان پر پہنچا دے گی۔

اس جہاں میں امیر کی جیت اور غریب کی ہار ہوتی ہے۔ دین محمد نے کچھ سوچ کر اس مطالبے سے سمجھوتہ کر لیا کیونکہ اس کی تین اور بھی بیٹیاں تھیں جن کو عزت سے وہ اچھے گھرانوں میں ہی بیاہنا چاہتا تھا پھر غربت کو گلے سے لگا کر رکھنے میں فائدہ ہی کیا تھا۔

عائشہ کو کامران نہ بیاہ سکا مگر اس کا باپ بیاہ کر لے گیا اور وہ ایک کروڑ پتی کی بیوی بن گئی تاہم اس امر کا علم کافی عرصے تک کامران کو نہ ہو سکا۔ دو سال بعد وہ خود ہی پاکستان آ گیا کیونکہ اس کو اپنے وطن اور عائشہ دونوں کی یاد بہت ستاتی تھی اور دیارِ غیر میں بھی چین لینے نہ دیتی تھی۔

وہ بغیر اطلاع آیا تھا۔ جونہی وہ گھر میں داخل ہوا، اس نے عائشہ کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں جب کچھ نہ آیا تو عائشہ نے یہ کہہ کر اس سے پردہ کر لیا کہ تم گھر سے چلے جاؤ کامران! کیونکہ میں تمہارے والد کے نکاح میں آ چکی ہوں، اب ان کی اجازت کے بغیر تم اس گھر میں مت آنا۔

<u>یہ سن کر کامران کو اس قدر صدمہ ہوا کہ بیہوش ہوتے ہوتے بچا۔ بہرحال آج اس کو اپنے باپ سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے باپ کو شوٹ کرے اور پھر عائشہ اور خود کو بھی گولی مار لے۔</u>

اس نے اسی ارادے سے پستول کو لوڈ کیا مگر اس کے اندر کے شریف انسان نے اس کو ایسا قدم اٹھانے سے روک دیا تاہم دل کا درد ایسا تھا کہ اس سے سہا نہ جاتا تھا تب اس نے باپ کے آنے سے پہلے بیٹھک میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر گولی چلا دی۔ وہ تو اس جہان سے چلا گیا مگر عائشہ کو عمر بھر کے لئے سسکنے کی خاطر زندہ چھوڑ گیا۔ عائشہ ایک بار مجھے ملی تھی، وہ بہت دکھی تھی۔ کہتی تھی۔ اے کاش کامران خود کو مارنے کی بجائے مجھے گولی مار دیتا تو اس کا بڑا احسان ہوتا کہ آج میرے دکھ تو ختم ہو جاتے۔

جئیں ہم کس کے لئے......؟

وہ میری دوست تھی بہت ہی پیاری سی، من موہنی لڑکی تھی اور اس کا نام عائشہ تھا۔ہم سب پیار سے اس کو عاشی پکارتے تھے۔آج بھی ان دنوں کو یاد کرتی ہوں جب ہم ساتھ پڑھا کرتے تھے تو دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے کیونکہ وہ بہت بھولی بھالی اور معصوم تھی۔کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کی قسمت ایسی ہوگی۔

وہ ایک غریب باپ کی بیٹی تھی مگر اس کی عادتیں اس قدر سلجھی ہوئی تھیں کہ غربت میں جو عیب ہوتے ہیں، وہ اس میں نہیں تھے۔اس کا باپ غریب ضرور تھا مگر خوددار تھا۔محنت، مزدوری کرتا اور اپنے بچوں کا پیٹ رزق حلال سے بھرتا تھا۔

غربت میں بھی خدا نے عائشہ کو حسن کی دولت سے نوازا تھا۔دکھ کی بات یہ تھی کہ اس کا کوئی بھائی نہ تھا جس کا غم اس کے باپ کو بہت تھا۔مفلسی میں تو بیٹیاں بوجھ ہوتی ہیں۔ان کو پالنا ہی ایک امتحان ہوتا ہے

پھر تعلیم دینا اور شادیاں کرنا ایک غریب آدمی کی تو کمر ہی ٹوٹ جاتی ہے۔یہی سبب تھا کہ اس کا والد اکثر کہا کرتا تھا کہ چار بیٹیاں ہونے کی وجہ سے میری کمر ٹوٹ گئی ہے۔ان میں سے اگر ایک کو خدا بیٹا بنا دیتا تو یہ ٹوٹی ہوئی کمر پھر سے جڑ جاتی۔

بیٹا نہ ہونے پر اکثر میاں، بیوی کی لڑائی بھی ہو جاتی تھی اور دین محمد بیوی کو کہتا تھا۔اگر میں کچھ آسودہ حال ہوتا تو یقیناً دوسری شادی کر لیتا بیٹے کی خاطر مگر اب تو میں دوسری شادی بھی نہیں کر سکتا کیونکہ مفلسی میں تن ڈھانپنے اور پیٹ بھرنے کے لئے سوچنا کرنے پڑتے ہیں، دوسری بیوی کو کہاں سے کھلاؤں گا؟

اور تجھ کو کوئی اپنی بیٹی کا رشتہ بھلا کیوں دینے لگا، پہلے کنبے کو تو پال لے بس ایسی ہی چخ چخ جب ان میاں، بیوی کے درمیان ہوتی تو عائشہ بہت پریشان ہو جاتی تھی تب وہ اسکول میں گم صم ہو جاتی۔میں اس سے پوچھتی۔کیا ہوا ہے؟اس کی آنکھیں نم ناک ہوتی اور کہتی۔مریم!دعا کرو کہ خدا مجھے ایک بھائی دے دیں ورنہ امی، ابو کی لڑائی یونہی ہوتی رہے گی۔

بھائی ہو کہ بہن، کیا فرق پڑتا ہے ؟پڑھے لکھے گھرانوں میں فرق نہیں پڑتا مگر ہمارے جیسے گھروں میں بیٹے کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ والدین کے لئے بھائی بڑھاپے کا سہارا ہی نہیں بہنوں کیلئے بھی محافظ ہوتے ہیں۔امیر کی بیٹی کی حفاظت دولت سے ہوتی ہیں تو غریب کی بیٹی کا تحفظ بھائی کرتے ہیں۔عائشہ ایسی فلسفیانہ باتیں کرتی کہ میں حیران رہ جاتی۔وہ بہت ذہین تھی۔قدرت نے اسے اچھا ذہن تحفے میں دیا تھا لیکن وہ بڑی مشکل سے تعلیم حاصل کر رہی تھی۔اس کے ایک ماموں اور خالہ پڑھے لکھے تھے اور انہی کی وجہ سے اس کو بھی اسکول جانا نصیب ہوا تھا ورنہ اس کے ددھیال والوں نے بڑی مخالفت کی تھی کہ ہمیں عائشہ کو نہیں پڑھانا ،ہمارے یہاں لڑکیاں نہیں پڑھا کرتی۔

دنیا کہاں جا رہی ہے مریم!ہمارے خاندان والے وہیں کے وہیں ہے۔کنویں کے مینڈک!وہ جھنجھلا کر کہتی۔جب چچا، پھوپھو آتے ہیں، مجھے چھٹی کرنی پڑتی ہے تاکہ وہ ابو کے کان نہ بھریں ورنہ وہ میرا اسکول جانا بند کروا دیں گے۔

بیچاری عائشہ کو بڑے مسائل درپیش تھے جو ہمیں نہیں تھے۔مثلاً اس کے پاس ایک ہی یونیفارم تھا جس کو روز رات کو اس کو دھونا پڑتا تھا۔کیونکہ صبح وہی دوبارہ پہن کر اسکول جانا ہوتا تھا، اگر کبھی صابن گھر میں عنقا ہو جاتا تو وہ اسکول یونیفارم کو خالی پانی سے کھنگال کر صاف کرتی تاکہ کم از کم پسینے کی بو نہ رہے۔اسکے پاس ٹوتھ پیسٹ خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے تھے لہذا وہ کوئلے کا منجن خود گھر میں بنا کر رکھتی تھی اور صبح سویرے اس منجن سے دانت صاف کر کے آتی تھی۔کاپیوں، پنسل وغیرہ کیلئے ہمیشہ تنگ رہتی تھی۔اگر جوتا ٹوٹ جاتا تو سوے سے جوڑ کر پہن لیتی مگر وہ پڑھائی میں طاق اور اول نمبر تھی۔اسلئے اس کی عزت کپڑوں سے نہیں اس کی اپنی لیاقت سے تھی پھر وہ حسین اس قدر تھی کہ جیسے چودھویں کا چاند ہوتا ہے۔گویا خدا نے خود اس کو اپنے ہاتھوں سے فرصت میں بنایا تھا۔

سچ ہے اللہ پاک بے نیاز ہے۔اگر وہ کسی کو کسی شے سے محروم رکھتا ہے تو دوسری نعمت سے نواز دیتا ہے۔عائشہ میں سیرت کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ بے پناہ اعتماد تھا۔

وہ جب مباحثوں اور تقریری مقابلوں میں حصہ لیتی تھی تو نمبر ون ہوتی تھی۔غربت کے باوجود وہ اعتماد کی دولت سے مالا مال تھی۔وہ غربت کے حلیے میں بھی امیر نظر آتی تھی۔یہی وجہ تھی کہ وہ ہر بات میں آگے آگے ہوتی تھی اور احساس کمتری اس کو چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔

ہم نے اکٹھے میٹرک پاس کیا۔عائشہ نے میٹرک میں ٹاپ کیا تو کچھ قریبی عزیز اس کے باپ کے سر ہو گئے کہ لڑکی کو اسکالرشپ ملے گا۔تم پر بوجھ نہ رہے گا، اس کو کالج میں پڑھاؤ، پڑھ لکھ کر تمہارا بازو بنے گی۔کچھ بن جائے گی تو تیرا سر فخر سے اونچا ہو جائے گا تمہارا بیٹا نہیں ہے تو یہی تمہارا بیٹا ہے، اس کو بیٹا سمجھ کر پڑھنے دو کیونکہ لائق بچی ہے۔غرض سب لوگوں کے کہنے سننے پر باپ راضی ہو گیا اور اس کو کالج جانے دیا حالانکہ ہمارے علاقے میں اس وقت صرف ایک ہی کالج تھا جس میں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے۔لڑکیوں کیلئے الگ سے کوئی گرلز کالج نہیں تھا۔

ہمارے کالج میں ایک کامران نامی لڑکا پڑھتا تھا جو ایک امیر ترین باپ کا بیٹا تھا۔اس کے والد کی بہت ساری زمین اور جائیداد تھی۔کامران کی ماں فوت ہو چکی تھی اور باپ کو امارت کا بہت غرور تھا کیونکہ دولت تھی کہ گھر میں سماتی ہی نہیں تھی۔

کامران کے باپ کا نام قائم خان تھا۔وہ ایک برا آدمی تھا اور اس کی بد خصلتوں کو علاقے کے سارے لوگ جانتے تھے تاہم اس کے سیاسی اثر و رسوخ کی وجہ سے کوئی بھی شخص اس کے منہ کو آنا پسند نہیں کرتا تھا۔